ڈاکٹر نفیس اقبال

صوفیائے کرام کی لسانی خدمات

صوفی صرف اشیاء کے تعلق کو ہی نہیں جانتا بلکہ اُن کی فطرت کو بھی جانتا ہے۔ وہ عوام کے دلوں کی نگہبانی ہی نہیں کرتا بلکہ اُن کے دلوں تک رسائی بھی حاصل کرتا ہے اور عوام کی زبان میں اُن کو کائناتی شعور دے کر روحانی صداقتوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر رہنا سکھاتا ہے۔ صوفی انسان کے خود آگاہی ادراک کا شعور رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ اُنہیں روحانی توازن کے حصول کے لیے بصارت کی تہذیب کے ساتھ ساتھ سماعت کی تہذیب کا درس بھی دیتا ہے۔ زبان چونکہ تہذیب کی نفیس ترین علامت ہے۔ اس لیے صوفیا نے عوام سے بات چیت کے لیے اُنہی کی زبان سیکھی۔ زبان کو سیکھنے کے ساتھ زبان کے ارتقاء میں بھی مدد دی۔ لہٰذا اُردو زبان کے سلسلے میں صوفیا کی لسانی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ افتخار عارف کے بقول اُردو کی لسانی بنیادیں تہذیبی اور ثقافتی تاریخ میں ہیں اور یہ تاریخ ہمارے دینی ادب اور تصوف کی روایات کے ذریعے آگے بڑھتی ہے۔[۱] ہم خیالی کے لیے ہمزبانی لازمی ہے۔ اس لیے صوفیا نے تلقین کے لیے اس خطے کی زبان سیکھی اور سرزمینِ ہند میں آنے والے صوفیا عوام سے انہی کی زبان میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے۔[۲]

صوفیا نے برِّصغیر میں تبلیغِ اسلام کے لیے یہاں کی عوامی زبان کو خود سیکھا۔ ان کے تذکروں میں ہندی گوئی یا ہندی دانی کا جو ذکر ملتا ہے، اُس سے مراد عربی فارسی آمیز وہی زبان ہے جو اُردو کی ابتدائی اور قدیم شکل کہلاتی ہے۔[۳]

خواجہ مُعین الدین چشتیؒ اور اُن کے خلفا جب برصغیر میں آئے تو برصغیر کی سیاسی، مذہبی اور ثقافتی فضا ہی اُن کے لیے اجنبی نہ تھی بلکہ لسانی ماحول بھی اُن کے موافق نہ تھا۔ ان کی اپنی زبان فارسی تھی لیکن مقامی لوگ اس سے ناواقف تھے۔ اس وقت پورے برصغیر میں پراکرتوں کی اپ بھرنش شاخیں رائج تھیں۔ پراکرتیں وہ زبانیں تھیں جو برہمنوں کی سنسکرت پر اجارہ داری کے ردِعمل کے طور پر از خود عوام میں پیدا ہوگئی تھیں۔ انہی پراکرتوں نے صدیوں کے ارتقا کے بعد جب نئی شکلیں اختیار کیں تو اپ بھرنش کے نام سے موسوم ہوئیں۔ صوفیائے چشت کی برصغیر میں آمد کے زمانے میں ملک کے مختلف حصوں میں اَپ بھرنش کی مختلف بڑی اور ذیلی شکلیں رائج تھیں۔[۴]

صوفیائے چشت کو سب سے پہلے جس علاقے کی زبان اور بولیوں سے واسطہ پڑا، وہ وہی علاقہ تھا جس پر مغربی ہندی کا قبضہ تھا۔ یہ علاقہ مشرقی پنجاب میں سرہند شریف سے لے کر الٰہ آباد تک اور شمال میں کوہِ ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں بندھیاچل اور روہیل کھنڈ تک تھا۔ قنوجی، راجستھانی، دہلوی، کھڑی بولی، ہریانوی جاٹو، بنگارو اور برج بھاشا اسی علاقے کی زبانیں اور بولیاں تھیں۔ دِلّی ان مختلف بولیوں اور زبانوں کا مقامِ اتصال تھا۔ ماہرینِ لسانیات کی رائے میں اِن سب بولیوں اور زبانوں میں غالب اثر برج بھاشا کا تھا۔ اس برج بھاشا کا غالب اثر لیے ہوئے دلّی اور اس کے گرد و نواح میں بولی جانے والی زبان نے ایک عرصہ بعد عربی، ترکی اور فارسی الفاظ کی آمیزش سے ایک نئی زبان کی شکل اختیار کر لی تھی جو پہلے ہندی (ہندوی) اور پھر ریختہ اور اُردو کے نام سے موسوم ہوئی۔[۵]

دہلی کے مسلمانوں کے قبضہ میں آ جانے کے بعد اس علاقے کی زبانوں میں خواجہ مُعین الدین چشتیؒ اور اُن کے خلفا اور مریدوں نے کافی کام کیا ہے۔ ان میں عربی فارسی کے الفاظ کس حد تک دخیل ہو گئے تھے، اس کا اندازہ اس دور کی تصانیف سے ہوسکتا ہے۔ یہ کتابیں دوہوں کے رنگ میں قدیم بھاشا میں لکھی گئی ہیں اور ان میں عربی اور فارسی کے کئی الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان تصانیف میں ایسے پھلوں، پھولوں، اسلحہ اور لباس کے نام بھی ملتے ہیں جو

مسلمانوں کے ساتھ اس علاقے میں آئے تھے۔ لاہور میں شیخ علی عثمان ہجویری المعروف داتا گنج بخش لاہوری نے غیر مسلموں میں تبلیغ کے عوامی انداز سے عربی فارسی الفاظ کو مقامی زبان میں منتقل کرنے کا غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر وسیع اور مؤثر کام کیا ہے۔

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم کے بقول ''کسی مذہب، مسلک یا تحریک کی اشاعت اور اس کے نظریات و اصول کے دوسروں تک ابلاغ کے لیے اس کے سرپرستوں اور کارکنوں کو ایسی زبان کا سہارا لینا پڑتا ہے جس کو اُن کے مخاطب آسانی سے سمجھ سکیں ورنہ قوتِ گویائی و شنوائی کے باوجود مبلغین کی حیثیت گونگوں اور سامعین کی حالت بہروں کی سی ہوگی۔ قرآنِ کریم کے عربی زبان میں نازل ہونے کا سبب بھی یہی تھا کہ اس کے ابتدائی مخاطب عرب تھے اگر پیغامِ ربانی کی زبان عربی کی بجائے کوئی اور ہوتی تو یہ خداوند کریم کی حکمتِ بالغہ کے خلاف ہوتا۔ یہی صورت برصغیر میں پیش آئی ہے۔ ہمارے ابتدائی صوفیائے چشت یا اُن کے خلفا نے جو صرف عربی فارسی پڑھے ہوئے تھے، جب تک اپنے علاقے کے مخاطبین کی زبان سے واقفیت پیدا نہ کرلی ہوگی۔ مقامی لوگوں تک اسلام اور اس کے اصولوں کا ابلاغ نہیں کرسکے ہوں گے۔'' [۶]

ہندی یا ہندوی ایک وسیع المعنیٰ لفظ ہے جسے اس وقت کے مؤرخ اور تذکرہ نگار برصغیر کی ہر زبان کے لیے استعمال کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ قدیم تذکرہ نگاروں نے پنجابی، گوجری، دکنی، مرہٹی وغیرہ کے لیے ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے۔ صوفیا نے اپنی تبلیغ و تلقین کے ابتدائی زمانے ہی سے فارسی میں ہندی یا ہندی میں فارسی کی آمیزش شروع کردی تھی۔ بلکہ ہندی زبان میں کچھ نہ کچھ کہنا بھی شروع کر دیا تھا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے دادا شیخ سعد اللہ نے کبیر پنتھی فرقہ کے سربراہ بھگت کبیر کے متعلق جو رائے دی ہے اس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ ہندی سمجھتے اور جانتے تھے۔ [۷]

صوفیا نے مقامی زبان (یعنی دکنی اور گوجری) میں جتنا تحریری سرمایہ نظم و نثر کی صورت میں جنوبی ہند میں پیدا کیا ہے، اُردو کی کسی اور قدیمی شکل میں نہیں کیا۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ، سیّد بندہ نواز گیسو درازؒ، شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ امین الدینؒ اعلیٰ، شاہ برہان

الدین جانمؒ، شیخ خوب محمد چشتیؒ اسی علاقے کی زبان کے مصنف ہیں۔شاعری میں ہندی شاعری کی بحروں کو استعمال کیا ہے۔ اس کی وجہ عوام کی عربی فارسی سے ناواقفیت تھی۔صوفیا نے عوام شناس زبان اور بحروں کو ترجیح دی۔ مسلمان صوفیا نے اپنی مجالسِ سماع میں ہندی موسیقی یعنی ہندی راگ راگنیوں کو رائج کیا اور اپنی تبلیغی نظموں اور تلقینی شاعری میں بھی انہیں جگہ دی۔

صوفیا نے ہندی موسیقی کی بحروں اور راگ راگنیوں کو استعمال کیا تو اس سے ہندوی (قدیم اُردو) کے رواج پانے میں بڑی مدد ملی۔ اُنہوں نے دوہے کو بہت اہمیت دی۔ اس دوہے نے پنجابی میں سی حرفی اور کافی کی شکلیں اختیار کر لی ہیں، دوہے کے علاوہ صوفیا نے جکری، خیال، قول، ترانہ اور کبت کی طرف بھی توجہ دی۔

اب ہم اُردوئے قدیم کی طرف متوجہ ہونے والے صوفیا کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے اُردوئے قدیم کا ایک لفظ، ایک جملہ یا ایک بیت بھی کہی ہے یا جن کی نظم ونثر میں باقاعدہ تحریریں موجود ہیں۔ان صوفیا نے اُردو کی ترویج میں حصہ لیا ہے۔ یہ اُردو کے معمار ہیں۔

خواجہ مُعین الدین چشتیؒ برصغیر پاک و ہند میں تصوف کے سلسلہ چشتیہ کے مؤسسِ اعلیٰ ہیں۔ان کے ہندی کلام کے متعلق قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ ان کے کلام کا نمونہ نہ ملے۔البتہ قدیم کتب کے حوالے سے اتنا ضرور پتا چلتا ہے کہ انہوں نے تقریباً پانچ سال تک ملتان میں قیام کیا اور اس دوران مقامی زبان بھی سیکھی۔[۸] جو اجمیر پہنچنے پر کام آئی کیونکہ وہاں کے لوگ عربی فارسی سے ناواقف اور غیر مسلم تھے۔ ملک محمد جائسی کی تصنیف اکھروٹی کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ خیال نہ کریں کہ اولیاء اللہ نے عربی زبان کے سوا کسی اور زبان میں کلام نہیں کیا کیونکہ تمام اولیاء اللہ ملک عرب سے خاص نہ تھے پس جس ملک میں یہ گئے، اس ملک کی زبان کو کام میں لائے اور گمان نہ کریں کہ کسی ولی نے ہندی زبان میں بات نہیں کی۔ کیونکہ جملہ اولیاء اللہ میں سے اوّل قطب الاقطاب خواجہ بزرگ مُعینؒ الحق نے اس زبان میں سخن فرمایا۔ اکھروٹی کے فاضل شارح کے اس بیان سے تصدیق ہوتی ہے کہ خواجہ مُعین الدین چشتیؒ نے ہندی زبان میں تبلیغ و تلقین ضرور کی ہے۔[۹] ان کے تبلیغی اور رابطہ عوام کے

کام کو دیکھتے ہوئے یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ اُنھوں نے مقامی زبان ضرور استعمال کی ہوگی۔ اس مقامی زبان کو مؤرخین و تذکرہ نگاروں نے ہندی (ہندوی) کہا ہے۔[۱۰]

مولوی عبدالحق لکھتے ہیں:

''افسوس کہ باوجود تلاش کے ہمیں حضرت خواجہ مُعین الدین چشتیؒ کا کوئی معتبر قول ہندی زبان میں نہیں ملا لیکن ان کی عالمگیر مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یقینی امر ہے کہ وہ ہندی زبان سے ضرور واقف تھے۔ کیونکہ ہندو بھی مسلمانوں سے کم ان کے معتقد نہیں۔''[۱۱]

خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (۵۰۵ھ تا ۶۳۳ھ) خواجہ مُعین الدین چشتی اجمیریؒ کے خلیفہ اور بڑے زبردست ولی تھے۔ آپ اوش سے سمرقند، بغداد اور اجمیر ہوتے ہوئے دہلی آئے۔ دہلی کی زبان اس وقت برج بھاشا، راجستھانی، پنجابی، ہریانوی اور کھڑی بولی کے عناصر لیے ہوئے تھی کیونکہ یہ شہر ان زبانوں کے مقامِ اتصال پر واقع تھا۔ اس زبان میں جب فارسی اور عربی کی تھوڑی بہت آمیزش شروع ہوئی اور اس نے ایک نئی شکل اختیار کی تو امیر خسروؒ نے اسے دہلوی کہا۔ اپنے پیرو مرشد حضرت خواجہ مُعین الدین چشتیؒ کی طرح خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ بھی مقامی زبان سے یقیناً روشناس ہوں گے کیونکہ اس کے بغیر اس وقت کی مقامی آبادی میں تبلیغ و تلقین کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔[۱۲]

ایک دفعہ باوا فرید گنج شکرؒ اپنے پیرو مرشد خواجہ بختیار کاکیؒ کو وضو کرا رہے تھے۔ خواجہ بختیار کاکیؒ نے آنکھ جو اوپر کی تو مرید کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی دیکھی۔ جب پیر نے مرید سے وجہ پوچھی تو مرید نے جواب دیا۔ ''آنکھ آئی ہے''۔ یہ واقعہ مولانا مبارک المعروف بہ میر خورد نے اسرار الاولیاء میں لکھا ہے جس سے باواؒ صاحب کے ساتھ ساتھ خواجہ بختیار کاکیؒ کی ہندی دانی اور ہندی فہمی کا پتا چلتا ہے۔ اگرچہ بقول الف۔ د۔ نسیم ہم خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے خواجہ بزرگ مُعین الدین چشتی اجمیریؒ کی طرح قدیم اُردو کے الفاظ، جملے اور ابیات پیش کرنے سے قاصر ہیں لیکن ان کی ہندی دانی اور ہندی گوئی سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے ملفوظات جو مجموعہ ہشت بہشت میں موجود ہیں اگرچہ فارسی میں ہیں لیکن اس کا امکان ہے کہ

ان میں سے بعض ملفوظات اہلِ مجلس کے لیے ہندی زبان میں کہے گئے ہوں لیکن اس وقت کی علمی زبان فارسی کے پیشِ نظر مرتب نے ان کو ہندی سے فارسی میں ڈھال دیا ہو۔[۱۳]

حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ (متوفی ۶۶۴ھ) حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مرید ہوئے اور رشد و ہدایت کے لیے اجودھن (پاک پتن) کو مرکز بنایا اور یہیں فوت ہوئے۔ خواجہ فرید الدینؒ گنج شکر کے حالات و ملفوظات پر لکھی جانے والی بعض قدیم کتابوں میں ان کے ہندی اقوال و ملفوظات کا ذکر بھی ملتا ہے۔ مولانا سیّد مبارک میر خورد کی کتاب سیر الاولیاء باوا فرید کے اقوال و ملفوظات پر مشتمل ہے۔ اس میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ باوا صاحب کے ایک مرید شیخ جمال الدین ہانسویؒ کا انتقال ہوا تو شیخ ہانسوی کی خادمہ جو مادرِ مومناں کہلاتی تھیں، شیخ کے خورد سال فرزند برہان الدین صوفیؒ کو لے کر باوا صاحب کی خدمت میں گئیں۔ باوا صاحبؒ نے ان کی بڑی عزت کی اور انہیں اپنی بیعت سے مشرف کیا اور نصیحت کی کہ کچھ وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کی خدمت میں بھی گزارا کرو۔ اس پر مادرِ مومناں نے ہندی زبان میں عرض کیا ''خوجا بالا ہے۔''[۱۴] یعنی خواجہ ابھی بچہ ہے۔ اس پر شیخ فریدؒ نے بھی ہندی زبان میں جواب دیا کہ ''پونوں کا چاند بھی بالا ہوتا ہے۔''[۱۵] مطلب یہ کہ چودھویں کا چاند بھی پہلی رات کو چھوٹا ہی ہوتا ہے اور بتدریج کمال کو پہنچتا ہے۔

اس قسم کے جملے مولانا محمد علی اصغر چشتی کی مشہور تصنیف جواہر فریدی میں بھی ملتے ہیں۔ اسرار الاولیاء کے مطابق شیخ فرید الدین گنج شکر اپنے ایک دوست کو بھیّا کہا کرتے تھے۔ ظاہر ہے یہ ہندی کا لفظ ہے۔ سیّد برہان الدین المعروف بہ قطب عالمؒ کے ملفوظات ''جمعاتِ شاہی'' میں بھی باوا فرید گنج شکرؒ کا ایک منظوم قول دیا گیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی ہندوی باتوں، اقوال، جملوں یا الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ باوا فریدؒ ہندی زبان جانتے تھے اور استعمال بھی کرتے تھے اور نظم کہنے کی طرف بھی رجحان رکھتے تھے۔ سخاوت مرزا نے قدیم اُردو کی ایک نایاب بیاض کے حوالے سے باوا فریدؒ کے منظوم ہندی اوراد کا بھی ذکر کیا ہے۔[۱۶] منظوم ورد قدیم ریختہ کی طرز میں فارسی ہندی الفاظ کی آمیزش لیے ہوئے جملوں میں ہے۔ مولوی عبدالحق

اور حافظ محمود شیرانی نے ایک ریختہ بھی مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ مولوی عبدالحق نے جھولنا شیخ فرید گنج شکر کے نام سے ایک طویل نظم کا بھی ذکر کیا ہے۔ حامد حسن قادری نے اپنی کتاب داستانِ تاریخ اُردو میں بابا فریدؒ کے ایک خاص عمل کا ذکر کیا ہے جو قدیم طرز کی اُردو میں ہے۔ بابا فرید پہلے شخص ہیں جن کا ہندوی اور ریختہ کلام دستیاب ہے۔

ڈاکٹر الف۔د۔نسیم شیخ حمید الدین صوفی ناگوریؒ (۵۷۰ھ تا ۶۷۳ھ) کے فارسی مکتوبات میں ہندوی جملوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان قدیم بزرگوں کے گھروں اور گفتگو میں ہندوی (قدیم اُردو) کا تھوڑا بہت رواج ضرور تھا۔ خواجہ علی احمد صابر کلیر شریفی بھی ہندوی سے آشنا تھے۔ شیخ صوفی بدھنیؒ (۷۰۴ھ) اپنی عام گفتگو میں ہندوی استعمال کرتے تھے۔ بدھنی کا لفظ بھی اُن کے نام کا جز ہونے کے اعتبار سے ان کی ہندوی سے رغبت اور تعلق کا صاف پتا دیتا ہے۔[۱۷]

شیخ شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتیؒ (۶۵۲ھ تا ۷۲۴ھ) قلندرانہ شان کے صاحبِ جلال اور صاحبِ اثر بزرگ تھے۔ مولوی عبدالحق نے فرہنگِ آصفیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں جس زبان کا رواج تھا، اُس کی کیفیت اس دوہے سے معلوم ہوسکتی ہے جو حضرت شرف الدین بوعلی قلندر پانی پتی کا ہے۔

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے روئے
بدھنا ایسی رین کو بھور کدھی نہ ہوئے[۱۸]

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاءؒ (متوفی ۷۲۵ھ) اپنے تبلیغی اور روحانی اثرات کی وجہ سے اہم اور مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ ان کے خلفاء اور مریدین کی وجہ سے برصغیر میں چشتیہ سلسلہ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حضرت امیر خسروؒ اور حضرت امیر حسن سنجریؒ جنھوں نے ہندوی اور ریختہ میں شعر بھی کہے، انہی کے مرید تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ خود بھی شعر کا ذوق رکھتے تھے۔ فارسی عربی اور ہندوی تینوں زبانوں سے واقف تھے۔ فارسی کے ساتھ ہندوی شاعری کا بھی شوق تھا۔ امیر خسروؒ کے ہندی زبان اور ہندی شاعری سے شغف

سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیر و مرشد بھی اس کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے۔ ان بزرگوں کی اس قسم کی شعوری اور لاشعوری کوششوں سے برصغیر میں اُردو کی قدیم شکل کے عام ہونے میں بڑی مدد ملی۔[۱۹]

حضرت امیر خسروؒ (متوفی ۷۲۵ھ) کی زبان دانی کا اعتراف ایران کے نقادوں اور شاعروں نے بھی کیا ہے۔ فارسی کے علاوہ امیر خسروؒ سنسکرت اور ہندی کے بھی عالم تھے۔ قدیم ریختہ میں بھی جس کی تشکیل ہندی اور فارسی الفاظ اور مصرعوں کی آمیزش اور پیوند کاری سے ہوئی ہے، ان کا متفرق کلام ملتا ہے۔ امیر خسروؒ کے ریختہ میں جہاں ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی یا نصف مصرعہ فارسی اور نصف ہندی کا ملتا ہے، ایسا ریختہ بھی نظر آتا ہے، جس میں صرف ایک دو ہندی الفاظ پورے فارسی بند کے آخری مصرعہ میں موجود ہیں۔ ریختہ کے علاوہ امیر خسروؒ کے بھاشا میں بھی شعر موجود ہیں۔ اپنے زمانے کی بھاشا کو امیر خسروؒ دیباچہ غرّۃ الکمال میں ہندی (ہندوی) کہتے ہیں۔

ریختہ کی ایک مشہور غزل کے چند شعر پیش کیے جاتے ہیں:

ز حال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو گا ہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجری دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کوں جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سناوے پیارے پی کو ہماری بتیاں

امیر خسروؒ نے مختلف اصنافِ سخن میں اشعار کہے ہیں جن کو دیکھ کر اُن کی قوتِ اختراع کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور بقول الف۔ د۔ نسیم یہ پتا چل جاتا ہے کہ اس دور میں اُردو زبان و ادب کی ابتدائی شکلوں نے کیا کیا رُخ اختیار کیا تھا اور امیر خسروؒ کی وجہ سے اس میں کیا کیا اختراعات ہوئی تھیں اور اُن کی کتنی تشہیر ہو چکی تھی۔[۲۰]

خواجہ برہان الدین غریبؒ (متوفی ۷۴۱ھ) حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ تھے۔ وطن ہانسی تھا لیکن وہ کسب فیض روحانی اور حصول علومِ شرعی و دینی کے لیے دہلی آ گئے تھے۔ سلطان محمد تغلق نے جب دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا تو حضرت بُرہان الدّین غریب بھی بہت سے درویشوں کے ساتھ دولت آباد آ گئے۔ حضرت امیر حسن سنجریؒ بھی اس قافلے میں شامل تھے۔ یہاں پہنچ کر حضرت برہان الدین غریبؒ اور اُن کے حلقہ کے مشائخ نے تبلیغ دین اور اصلاحِ احوالِ قلب و معاشرہ کا کام جاری رکھا جس سے جنوبِی ہند کے بے شمار لوگوں کو دینی اور روحانی فائدہ پہنچا۔[۲۱]

شیخ برہان الدین غریبؒ عربی اور فارسی زبانوں کے علاوہ مقامی زبان سے بھی آشنا تھے۔ اُنھوں نے اپنی کتاب ''شمائل الاتقیا'' کا ہندی میں ترجمہ ایک بزرگ میراں یعقوب سے کروایا۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم لکھتے ہیں:

''اس ترجمہ سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ شیخ برہان الدین غریبؒ نے خود میراں یعقوب کو ہندی میں ترجمہ کرنے کے لیے کہا تھا جس سے ان کی ہندی سے رغبت کا پتا چلتا ہے۔ چاہے یہ تبلیغی تقاضے کے تحت ہی کیوں نہ ہو۔''[۲۲]

''شمائل الاتقیاء'' گولکنڈے کے قدیم نثری کارناموں میں ایک خاص امتیاز کی حامل ہے۔ متصوّفانہ رنگ میں ڈوبی ہوئی اس کتاب کے بارے میں ڈاکٹر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں:

''شمائل الاتقیاء'' اگرچہ ''سب رس'' سے صرف تینتیس سال بعد لکھی گئی ہے لیکن اس کی زبان بہت صاف اور مقابلتًا جدید معلوم ہوتی ہے۔ میراں یعقوب کی عبارتیں جدید نثر سے بہت قریب نظر آتی ہیں اور اس سے پتا چلتا ہے کہ زبان کتنی تیزی کے ساتھ نشو و نما کی منزلیں طے کر رہی تھی--- میراں یعقوب نے بہت سے قدیم الفاظ ترک کر کے ان کی جگہ جدید لفظ استعمال کیے ہیں--- ''شمائل الاتقیاء'' کی زبان قدیم اور جدید نثر کی درمیانی کڑی معلوم ہوتی ہے۔''[۲۳]

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے والد سیّد محمد یوسف عرف عام میں راجا یا سیّد راجا کے نام

سے مشہور تھے۔ وہ ریختہ گو شاعر تھے۔ ہندوی اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھتے تھے۔ خواجہ بندہ نواز گیسودراز اور اُن کے خاندان کے دوسرے بزرگوں کے حالات میں یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ دینی اور عرفانی مشاغل کے ساتھ ساتھ ان کا دھیان مقامی زبان میں تبلیغ و تلقین کے لیے تحریریں تخلیق کرنے کی طرف بھی تھا۔ جنوبی ہند میں دولت آباد علماء و مشائخ کا گھوارا تھا۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ (متوفی ۷۹۵ھ) جنوبی ہند کے اولیائے کرام میں سے تھے۔ انہوں نے دکنی زبان میں چھوٹے چھوٹے رسالے تصنیف کیے ہیں۔ شمس اللہ قادریؒ نے ''اُردوئے قدیم'' میں انہیں دکن کا سب سے پہلا اُردو مصنف کہا ہے۔ نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اُردو'' میں حضرت بندہ نواز گیسو دراز کو اُردو کا پہلا مصنف کہا ہے لیکن زمانے کے اعتبار سے شیخ عین الدین گنج العلمؒ کو اولیت دینی پڑتی ہے کیونکہ خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کا عرصۂ عمر ۱۳۲۱ء تا ۱۴۲۲ء ہے اور شیخ عین الدین گنج العلمؒ کا ۱۳۰۶ء سے ۱۳۹۳ء/ ۱۳۹۶ء تک۔ [۲۴]

ہندی یا ہندوی اُردو کی قدیم شکل ہے۔ پرانے تذکرہ نگاروں نے پنجابی، دکنی، گوجری اور دیگر کئی علاقائی زبانوں کے لیے یہی لفظ ہندی استعمال کیا ہے۔ یہاں تک کہ اہلِ اُردو بھی اپنی زبان کو ہندی کہتے رہے ہیں۔ سیّد محمد عبداللہ حسینیؒ صاحب تصنیف بزرگ ہیں اور اُنہوں نے سیّد عبدالقادر جیلانیؒ کی کتاب ''نشاط العشق'' کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا ہے اور اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ سیّد محمد عبداللہ حسینی کا تعلق بہمنیہ دور سے ہے، جس وقت دکنی زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ شیخ عین الدین گنج العلمؒ، حضرت بندہ نواز گیسو درازؒ اور سیّد محمد عبداللہ حسینیؒ اس دور کے تین ایسے بزرگ ہیں جنہوں نے دکنی زبان میں مذہب اور تصوف کے موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور بقول الف۔ د۔ نسیم ان لوگوں کی علمی اور روحانی حیثیت کے علاوہ تاریخ لسانیات میں بھی اہمیت ہے۔ یہ بزرگ اُردوئے قدیم کے نقیب ہیں۔ [۲۵]

خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ کے علمی اور روحانی مرتبہ کا اندازہ ان کے مریدوں، خلفاء اور اُن کی تصانیف کے متنوع موضوعات سے ہوسکتا ہے۔ تصوف کے موضوع پر ان کی تقریباً

تیس کتابیں ہیں جن میں زیادہ تر فارسی زبان میں ہیں اور باقی عربی اور دکنی میں۔ مؤلف روضۃ الاولیاء نے لکھا ہے کہ خواجہ بندہ نواز گیسو درازؒ نماز ظہر کے بعد مریدوں کو علم تصوف اور حدیث کا درس دیا کرتے تھے اور جو لوگ عربی فارسی سے ناواقف تھے، ان کے لیے دکنی زبان میں تقریر فرمایا کرتے تھے۔[۲۶] مریدوں کی فرمائش پر انہوں نے دکنی نثر میں چھوٹے بڑے رسالے بھی لکھے ہیں۔ رسائل کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) معراج العاشقین، (۲) ہدایت نامہ، (۳) عشق نامہ، (۴) تلاوت الوجود، (۵) درالاسرار، (۶) شکار نامہ، (۷) تمثیل نامہ، (۸) ہشت مسائل، (۹) سہ بارہ۔

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز شاعر بھی تھے۔ ان کی زیادہ تر ہندی (دکنی) شاعری موسیقی یعنی راگ راگنیوں کے تابع ہے۔ انہوں نے ہندی اور سنسکرت زبانوں اور ہندی سماع اور موسیقی کو غیر مسلموں پر اثر انداز ہونے کے لیے بڑی خوبی سے استعمال کیا۔ اُن کے نزدیک ہندی کی چیزیں نرم، لوچ دار اور دل میں رقّت پیدا کرنے والی ہوتی ہیں اور اس کا راگ بھی نرم ہوتا ہے اور طبیعت میں عاجزی پیدا کرتا ہے۔[۲۷]

سیّد اکبر حسینیؒ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے فرزند تھے۔ انہیں دکنی نظم و نثر دونوں سے دلچسپی تھی۔ مولوی محمد یافعی نے ان کے ارشادات پر مشتمل ایک کتاب شائع کی ہے جو نظم و نثر کے ملے جلے انداز میں ہے اور زبان تقریباً وہی ہے جسے جملہ اولیائے دکن نے استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نثر پارہ کو دیکھیے۔

''سنو اے مسلمانو، طالبِ خدا کے بوجھو، زندگی سہل ہے۔ جیون کا بھروسا نہیں۔''[۲۸]

شاہ میراں جی شمس العشاقؒ (متوفی ۹۰۳ھ) مکے میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان آ کر بیجاپور میں قیام کیا۔ اپنے زمانے کے اولیائے کبار میں سے ہوئے ہیں۔ خواجہ کمال الدین بیابانی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ تصوف کے موضوع پر انھوں نے چھوٹے بڑے کئی رسالے لکھے

ہیں۔ زبان ان سب رسالوں کی دکنی ہے۔ شاہ میراں جی نے بیجاپور میں بقول مولوی عبدالحق:

''ایک ایسے خاندان کی بنیاد ڈالی جس میں ان کے جانشین یکے بعد دیگرے کئی پشت تک بڑے صاحب علم اور صاحب ذوق ہوئے اور انھوں نے اسی (ہندی) کو اپنی زبان سمجھا اور اسی زبان میں سلوک و معرفت پر متعدد رسالے اور نظمیں لکھیں۔ اس خاندان کے مریدوں اور معتقدوں نے بھی اپنے مرشدوں کی پیروی میں اسی زبان کو اپنی تصنیف و تالیف کا ذریعہ بنایا۔ یہ اسی مبارک خاندان کا اثر تھا کہ بیجاپور میں زبان کو اس قدر فروغ ہوا اور وہاں ایسے ایسے خوش بیان اور بلند خیال شاعر پیدا ہوئے جن کی نظیر اُردو کے شاعروں میں بہت کم ملتی ہے۔'' [۲۹]

تصوف کے مسائل کو ہندی میں لکھنے کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو عربی جانتے ہیں نہ فارسی، اُن کے لیے ہندی میں یہ باتیں لکھی گئی ہیں۔ ظاہر پر نہ جانا چاہیے، باطن کو دیکھنا چاہیے---گھورے پر بارش ہوئی اور وہاں کسی کو چمکتا ہوا ہیرا مل گیا۔ یہ زبان گویا گھورے کا ہیرا ہے، کوئی معقول آدمی ایسے ہیرے کو گندہ سمجھ کر پھینک نہیں دے گا۔'' [۳۰]

شاہ میراں جی کے تصوف کے موضوع پر قابلِ ذکر رسالے شرح مرغوب القلوب، جل ترنگ اور گل باس ہیں۔ نثر کے علاوہ ان کے رسالے دکنی نظم میں بھی ہیں۔ ان میں ایک کا نام شہادت الحقیقت ہے۔ یہ ایک طویل نظم ہے لیکن زبان سلیس اور سادہ ہے۔ دوسرا منظوم رسالہ خوش نامہ ہے۔ خوش نغز بھی انہی کا رسالہ ہے۔

میراں جی شمس العشاق نے ہندی زبان فیضانِ نبویؑ سے سیکھی۔ میراں جی کا ہندی زبان کو ایک بشارت کے تحت اختیار کرنے کا واقعہ مولوی عبدالحق نے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

کیا یہ کچھ کم کرامات ہے کہ ایک شخص جو مکے میں پیدا ہوتا ہے ہند میں آ کر یہیں

کی زبان میں تعلیم وتلقین کرتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی میں لکھتا پڑھتا اور اسی میں نغمہ سرا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنے حال میں تحریر فرماتے ہیں کہ وہ مکے سے مدینہ شریف کی زیارت کو گئے اور تقریباً بارہ سال روضۂ مبارک کے قریب رہے۔ ایک شب جمعہ کو آنخضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں ہندوستان جانے کے لیے ارشاد فرمایا تو آپ نے نہایت عجز سے یہ عذر کیا کہ مَیں ہندوستان کی زبان سے ناواقف ہوں۔ آنخضرتؐ نے زبانِ مبارک سے فرمایا: ''ہمہ زبان بشما معلوم خواہد شد'' اور یہی ہوا۔ ان کا تقریباً سارا کلام اسی ہندی زبان میں ہے۔ اس سے سمجھ لینا چاہیے کہ اس وقت ہندوستان کی عام زبان یہی تھی۔'' [۳۱]

شاہ برہان الدین جانمؒ (متوفی ۹۹۰ھ تقریباً) میراں جی شمس العشاق کے فرزند اور خلیفہ تھے۔ شاہ برہان الدین نے اپنے والد میراں جی کی طرح ہندی میں لکھنے کی معذرت کی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اُن کے زمانے میں عالم اور ثقہ لوگ ہندی میں لکھنے سے احتراز کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ ظاہر پر نہ جاؤ اور باطن کو دیکھو۔ لفظوں کو نہ دیکھو اور معنی پر خیال کرو۔ ہندی لفظوں میں کوئی عیب اور خرابی نہیں۔ اگر سمندر کے موتی کسی ڈبرے یا جوہڑ میں ملیں تو عقلمند آدمی انہیں کیوں نہ لے۔ فرماتے ہیں:

''عیب نراکھیں ہندی بول'' [۳۲]

ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم لکھتے ہیں:

''اس ہندی اختیاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین اور معرفت کی باتیں ان لوگوں تک بھی پہنچ گئیں جو عربی فارسی سے نابلد تھے اور ساتھ ساتھ ایک نئی زبان (جو اس وقت ہندی اور بعد میں اُردو کے نام سے منسوب ہوئی) کی ترویج وترقی میں بھی مدد ملی۔'' [۳۳]

ڈاکٹر سیّدہ جعفر، برہان الدین جانمؒ کو دکن کا پہلا مصنف مانتے ہوئے ہوئی لکھتی ہیں:

''وہی دکن کے پہلے مصنف تھے۔'' [۳۴]

شاہ برہان الدینؒ جانم کے نثری رسالے کا نام بحرالحقائق ہے۔ اس کی زبان دکنی ہے اور مضامین عارفانہ ہیں۔ یہ بھی سوال و جواب کی طرز میں ہے۔ سوال و جواب کا جو انداز میراں جی شمس العشاق نے منظوم رسالوں میں اختیار کیا، وہی انداز یہاں نثر میں ملتا ہے۔ یہ انداز مسائل کی تفہیم کا مؤثر اور عمدہ انداز ہے۔ ان کا دوسرا رسالہ نثر میں ''کلمۃ الحقائق'' ہے۔

ڈاکٹر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں کہ ''کلمۃ الحقائق'' دبستان بیجاپور کی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے مصنف کے بارے میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ہماری قدیم ترین نثر کا ایک مستند نمونہ ہے۔ عام طور پر مریدِ خدا، وجود، انسانی ذات و صفات اور دوسرے مختلف متصوفانہ مسائل سے متعلق جن سوالوں کے جوابات جاننا چاہتے ہیں، انہیں جانم نے ''کلمۃ الحقائق'' میں سادہ اور عام فہم انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ رسالہ اُس دور کے دوسرے رسالوں کی بہ نسبت ضخیم ہے اور اس کی ایک منفرد خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مختلف نسخوں میں کوئی اہم اختلاف نسخ نظر نہیں آتا۔ جانم نے اپنی زبان کو ''گجری'' سے تعبیر کیا ہے اور سنسکرت کے تت سم اور تت سبھو الفاظ بکثرت استعمال کیے ہیں۔ ''کلمۃ الحقائق'' میں حسب ضرورت فارسی نثر سے بھی کام لیا گیا ہے۔ کہیں کہیں یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنف اپنے مطلب کو دکنی نثر کا جامہ پہنانے پر زیادہ قدرت نہیں رکھتا۔ اس لیے وہ فارسی نثر کی مدد سے اپنے مافی الضمیر کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور دکنی عبارتیں لکھتے لکھتے فارسی جملے تحریر کرنے لگتا ہے۔ عبارتیں کہیں کہیں نا قابلِ فہم اور گنجلک بھی ہوگئی ہیں۔ غیر مربوط جملوں میں تسلسلِ بیان کے فقدان کا احساس ہوتا ہے، غالباً نثر کی اوّلین کاوش ہونے کی وجہ سے بھی یہ سقم پیدا ہوا ہے۔ جانم نے مکالمے کے انداز کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنے عہد کی عام فہم اور سلیس زبان استعمال کی ہے۔ ان کے بعض جملے خوبصورت اور دل نشین معلوم ہوتے ہیں۔ عبارت کے درمیان اشعار اور دوہے بھی نقل کیے گئے ہیں اور کہیں کہیں مقفیٰ جملے بھی موجود ہیں۔ بعض جگہ طالب کا سوال اور مرشد کا جواب دونوں نظم میں ہیں۔ برہان الدین جانم کی نثر میں ترسیل

کی بعض کوتاہیوں کے باوجود انشاء کے محاسن کی جھلک کہیں کہیں ضرور نظر آتی ہے۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ مصنف کے سامنے نثر کا کوئی ایسا نمونہ موجود نہیں تھا جو اس کی رہبری کر سکتا۔[۳۵]

شاہ برہان الدین جانمؔ کا زیادہ تر سرمایہ نظم میں ہے۔محی الدین قادری زور نے اپنی تالیف اُردو شہ پارے میں ان سب کا تعارف کرایا ہے۔ اُنہوں نے غزلیں اور دوہے بھی لکھے ہیں۔مثنوی اور خیال بھی لکھے ہیں۔ بقول مولوی عبدالحقؔ ''شاہ برہان کا کلام اگرچہ سادہ ہے لیکن بعض مقامات پر شاعرانہ لطافت بھی پائی جاتی ہے۔''[۳۶]

دکن کے صوفیا میں امین الدین اعلیٰ کی شخصیت ایک امتیازی شان کی حامل نظر آتی ہے۔ امین الدین اعلیٰ برہان الدین جانم کے فرزند اور شمس العشاق شاہ میراں جی کے پوتے تھے۔ وہ باپ داد کے قدم بقدم چلتے ہیں۔ وفات ۱۰۸۶ھ میں ہوئی۔

شاہ امین اور اُن کے مریدوں نے نظم و نثر کی ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ایک ایسی زبان جو ''گھر بھاکا'' کہلاتی تھی، رشد و ہدایت کا مؤثر ذریعہ بن گئی جس کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس زبان میں فکر وفن کے اظہار کی اچھی صلاحیت پیدا ہوتی گئی۔ امین الدین اعلیٰ نے نثر میں بہت سے رسالے سپردِ قلم کیے۔ ''گنجِ مخفی''، ''رسالہ وجودیہ''، ''گفتار امین الدین''، ''ظاہر و باطن''، ''عشق نامہ''، ''شرح کلمہ طیب'' اور ''کلمۃ الاسرار'' میں انہوں نے اپنی تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ ''گنج مخفی'' میں وجود کے مراتب اور تنزلات کی مفصل شرح کی گئی ہے اور اس رسالے کی نثر مربوط و مرتّب ہے اور بقول ڈاکٹر سیّدہ جعفر:

''زبان کی قدامت کے باوجود کہیں اشکال پیدا نہیں ہوتا، ایک ایسے دور میں جبکہ زبان ابھی عالمِ طفولیت میں تھی اور اپنے تشکیلی دور سے گزر رہی تھی، اتنی اصطلاحات وضع کرنا اور انہیں عوام کے لیے قابلِ قبول بنا کے پیش کرنا آسان کام نہیں تھا۔ شاہ امین الدین کی عبارتیں سلجھی ہوئی اور اُن کے فقرے برجستہ ہیں۔''[۳۷]

''رسالہ وجودیہ'' میں مصنف نے اپنے مخصوص تصوف یعنی پانچ عناصر پچیس گن سے بحث کی ہے۔ ان کے بیانات میں استعارے بھی موجود ہیں۔ ''گفتار امین الدین'' میں زیرِ بحث مسائل کی تائید میں استدلال سے اپنی بات میں زورِ بیان پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ رسالہ ظاہر و باطن کی عبارتوں میں روانی نظر آتی ہے۔ ''کلمۃ الاسرار'' میں دوسرے رسالوں کی نسبت زیادہ ادبیت ہے اور یہ رسالہ شاہ امین کا سب سے طویل نثری کارنامہ ہے۔

شاہ امین کی عبارتوں میں ربط بھی ہے اور روانی و سلاست بھی۔ تسلسل کی کمی نہیں اور مفہوم کی وضاحت میں تشبیہات و استعارات کو بھی استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں:

''برہان الدین جانم کی زبان پر ''دیسی الفاظ'' کا غلبہ تھا لیکن شاہ امین کی تحریریں عربی اور فارسی سے اثر پذیری کی غماز ہیں۔ اُنھوں نے فارسی اضافتوں اور ترکیبوں سے بھی کام لیا ہے۔ اپنے رسائل میں وہ دکنی نثر کے درمیان فارسی جملے لکھتے جاتے ہیں۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے والد کی قائم کی ہوئی روایات کو آگے بڑھایا اور اُردو نثر کو اس منزل تک پہنچانے میں مدد دی جہاں اس کے منفرد خدوخال اُبھر سکے اور اس کا مخصوص مزاج اور انفرادی آہنگ اور لب ولہجہ متعین ہو سکا۔'' [۳۸]

امین الدین اعلیٰ نے دوہے بھی لکھے ہیں۔ ایک دوہے میں کہتے ہیں:

مرنا ہار، جیونا بسار
جیونا ہار، مرنا بسار
سو وہ سریجن کی دیکھ بچار
لال سریجن دیکھن پاوے
آپس میں دیکھ آپ گنواوے
من رانی حضرت قول بھواوے　(وغیرہ)

(''اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام''، ص ۵۱)

میراں جی حسین خدانما (متوفی ۱۰۷۴ھ) برصغیر پاک و ہند کے ان صوفیا کی روایت سے تعلق رکھتے ہیں جنہوں نے اُردو زبان کو عظیم روحانی اور انسانی اقدار کے فروغ کے لیے استعمال کیا۔ مرشد سے سرمایہ علمی اور فیضِ روحانی حاصل کرنے کے بعد وہ حیدرآباد آ گئے اور یہیں بیٹھ کر خلقِ خدا کی بھلائی اور ہدایت کا کام کرتے رہے۔ میراں جی خدانما نے شیخ احمد کی تصنیف تمہیدات عین القضاۃ کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا ہے۔

ڈاکٹر سیّدہ جعفر لکھتی ہیں:

''میراں جی خدانما کا شمار ان قدیم نثر نگاروں میں ہوتا ہے جن کی تصانیف نے اُردو نثر کی راہ متعین کی اور اس کا معیار قائم کیا۔ ان کی نثر عام فہم اور سلیس ہے۔ گنجلک اور پیچیدہ عبارتیں کہیں نظر نہیں آتیں۔ کہیں کہیں قافیے سے بھی کام لیا ہے۔ خدانما کی نثر کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ مثالوں کے ذریعے سے اپنے مافی الضمیر کی وضاحت کرتے ہیں اور یہ مثالیں اُنھوں نے روزمرہ زندگی سے اخذ کی ہیں کیوں کہ ان کے مخاطب ایسے عوام تھے جن کے لیے تصوف کے اسرار و رموز کی تفہیم آسان نہیں تھی۔ خدانما نے ان کی عملی اور ذہنی استعداد کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اپنے مطالب کی سادہ زبان میں مثالوں کی مدد سے اچھی صراحت کی ہے۔''[۳۹]

جنوبی ہند کے صوفیا نے دکنی اور گوجری میں نثر و نظم میں کام کیا کیونکہ مقامی آبادی کی اکثریت دکنی آشنا تھی۔ صوفیا جانتے تھے کہ جس زبان میں بھی معرفت و ہدایت کی بات سمجھی جائے وہی زبان اختیار کرنی چاہیے۔ اُردو کو یہی فضیلت حاصل ہے کہ وہ برصغیر کے کسی خطے کی مادری زبان نہ ہونے کے باوجود بھی اس خطے کی زبان ہے۔ اسی لیے قدیم تذکرہ نگاروں نے ہر خطہ کی زبان کو ہندی یا ہندوی کہا ہے۔ برصغیر کے ہر علاقے کی زبان اُردو کے وسیع سمندر میں مدغم ہے۔

پروفیسر ابراہیم ڈار نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضرت شاہ عالم نے محمود بیکڑہ کو کہا تھا

''پڑھ ڈوکرے'' (یعنی پڑھ اے بیٹے!) شاہ عالم کے اس طرز کے اور جملے بھی ملتے ہیں جن سے ہم ان کی قدیم اُردو سے آشنائی جان سکتے ہیں۔

شیخ بہا الدین باجنؒ (متوفی ۹۱۲ھ) فارسی اور ہندی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ باجنؒ ان کا تخلص تھا جس کے معنی ساز ہیں۔ ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم لکھتے ہیں:

''اس تخلص سے اس بات کی بھی نشان دہی ہوتی ہے کہ شیخ بعض دوسرے قدیم بزرگانِ چشت کی طرح اپنی شاعری کو بھی راگ راگنیوں کے تابع رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے کہ شعر میں کشش، وقت اور موسم کی نسبت سے اسے کسی سُر تال کے تابع کرنے سے زیادہ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس فارمولے سے صوفیا چشت ہندوؤں کو مندر کی فضا سے نکال کر محفلِ سماع میں لائے ہیں اور اپنے دوہوں، شبدوں اور اشلوکوں کے ذریعے ان کو توحید کی وہ مے پلائی ہے کہ مندر گریز اور مسجد آشنا ہو گئے۔ سُر جسے ہندو خدا کہتے تھے اہرمن سے یزداں بن گیا۔'' [۴۱]

شیخ باجن ہندی اور فارسی میں شعر کہتے تھے۔ اُنھوں نے فارسی زبان میں ایک تصنیف اپنے پیر کے حالات اور مریدوں کی ہدایت میں لکھی ہے اور اس میں اپنے اشعار کثرت سے لائے ہیں۔ باجن بقول محمود شیرانی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو ''زبانِ دہلوی'' کے نام سے یاد کیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُردو ان ایام میں بھی برج بھاشا سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔ [۴۲]

شیخ باجن کی کتاب ''خزانۂ رحمت'' کے آخری باب میں ہندی دوہے اور جکریاں ہیں۔ شیخ باجن کے اشعار کی زبان اتنی صاف ہے کہ بعض شعر آج کے زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔

قاضی محمود دریائی بیر پوریؒ (متوفی ۹۴۱ھ) گجرات کے اولیائے عظام میں سے تھے۔ گجرات چونکہ نسبتاً محفوظ علاقہ تھا، اس لیے دلی کے عوام کے ساتھ علما اور صوفیا بھی دلی سے ہجرت کر کے گجرات چلے گئے۔ تصوف اس عہد کا تخلیقی استعارہ تھا۔ گجری ادب اسی استعارے سے پیدا ہوا۔ اس زمانے میں گجرات مقامی زبان میں ذریعۂ اظہار کا سب سے سرگرم مرکز بن

گیا۔ گجری ادب کے ادیب نے فارسی کی جگہ گجری زبان کو ترجیح دی۔ گجرات میں فارسی زبان و ادب کی روایت گہری نہ تھی، اس لیے یہاں کے صوفیا اپنا پیغام گجری میں دے رہے تھے۔[۴۳]

جکری صوفیانہ طرزِ اظہار اور بزرگانِ طریقت سے عقیدت ومحبت کے اظہار کے لیے ایک صنف تھی۔ قاضی محمود دریائی کی شہرت کا سبب ان کی لکھی ہوئی جکریاں تھیں۔ جکری کا آہنگ ہندوی رنگ سے عبارت ہے۔ محمود دریائی کی شاعری کا لب ولہجہ اور شعری لغت ان کو اس دور کی مقبول لوک روایت سے منسلک کرتی ہے۔

شاہ علی محمد جیو گام دھنی (متوفی ۹۸۳ھ) باجن اور محمود دریائی کی روایت کے صوفی شاعر ہیں۔ زبان واسالیب پر ہندوی روایت کا اثر ہے۔ کہیں کہیں عربی و فارسی الفاظ یا صوفیانہ اصطلاحیں ملتی ہیں جو ان کے کلام کو گجری اُردو کہنے کا واحد جواز بنتی ہیں۔ بہ صورتِ دیگر ان کے کلام کو حقیقتاً ہندی کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ چونکہ یہ سب شعرا ایک خاص مقصد کے لیے ادب تخلیق کر رہے تھے، لہٰذا وہ زبان کا وہی اسلوب اختیار کرتے ہیں جو لوگوں میں مقبول تھا اور قابلِ فہم بھی۔ اسی لیے عربی فارسی الفاظ کی اصل صورتوں کو پیش کرنے سے بھی کہیں کہیں گریز کیا گیا ہے اور جہاں ممکن ہو سکا ہے، وہاں مقامی اثرات کے غلبہ کے سبب ان الفاظ کو ہندی بنا لیا گیا ہے جس سے ابلاغ کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ بعض منزلوں پر ان کا لسانی اسلوب عربی و فارسی اثرات سے بہت دُور ہو جاتا ہے اور اس پر مقامی زبانوں کی چھاپ بہت نمایاں ہو جاتی ہے۔[۴۴]

شاہ علی محمد کا ایک کام بہت قابلِ قدر ہے۔ ہندی اوزان کی روایت میں لکھتے لکھتے وہ فارسی اوزان کی طرف بھی متوجہ ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ مقامی رنگ کی دھنوں اور نغموں کے ساتھ ساتھ ان کے فارسی کے تہذیبی آہنگ بھی اپنے رنگ دکھانے لگتے ہیں۔ یہ ایک اہم تبدیلی تھی جو مستقبل میں زبان کے وجود کو بدلنے میں معاون ثابت ہونے والی تھی۔[۴۵] اس تبدیلی کے متعلق شیرانی صاحب لکھتے ہیں:

''شاہ علی محمد ان بزرگوں میں سے ہیں جنھوں نے فارسی اوزان کو ہندی اوزان میں روشناس کرنے کی ابتدائی کوشش کی ہے۔ ان کے ہاں ہزج مربع سالم و رجز مربع سالم میں دو نظمیں موجود ہیں۔'' [۴۶]

جیو گام اعلیٰ درجہ کا جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ اُن کا لکھا ہوا ایک سراپا اسی جمالیاتی ذوق کا حامل ہے۔ ہندوی اسلوب کا یہ سراپا اس عہد کی جمالیات کا عکاس ہے۔[۴۷]

اس سراپا کا شعری اظہار ڈاکٹر تبسم کاشمیری کی تاریخ میں بمع ترجمہ موجود ہے۔

عسکری فتح کے بعد سیاسی اور انتظامی دباؤ موثر ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تہذیبی اثر بڑھتا ہے۔ جب عسکری، سیاسی اور تہذیبی دباؤ میں ربط اور استحکام پیدا ہونے کی شکل بنتی ہے تو لسانی دباؤ کا مرحلہ شروع ہو جاتا ہے اور مقامی لسانی روایت پر فارسی اثرات جھلکنے لگتا ہے۔ گجرات اور دکن میں بالخصوص اس نقطۂ نظر کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ گجرات کی فتح ادبی تاریخ کے رُخ کو بدل دیتی ہے۔ وہ زبان جسے ''گجری'' کہا جاتا تھا اور جو تقریباً ڈیڑھ سو برس کے لگ بھگ مقامی اثرات کے غلبہ میں رہ کر پروان چڑھی، اس کی تنہائی کا زمانہ گزرنے کا وقت آ جاتا ہے۔ شیخ باجن سے شاہ علی محمد جیو تک زبان کی جو صورت بنی تھی، وہ ہندوی اثرات کی ترجمان تھی مگر اکبر کی فتح گجرات سے فارسی کا نفوذ ہوتا ہے۔ مغلیہ تہذیب سرایت کرنے لگتی ہے۔[۴۸]

خوب محمد چشتی (متوفی ۱۰۲۳ھ) کی دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں: (۱) ''خوب ترنگ'' (۲) ''چھند چھنداں''، ''خوب ترنگ'' کے بعض حصے بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری گاڑھے طور پر ہندوی اسلوب میں ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ فارسی اثرات کی عملی شہادت بھی ملتی ہے۔ گویا ''خوب ترنگ'' میں زبان ہندوی بھی ہے اور اس اسلوب سے گریز کرتی ہوئی بھی نظر آتی ہے۔ مجموعی طور پر فارسی روایت کا دباؤ موجود ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فارسی اور ہندوی کی شعری لغت میں تصادم کی صورت بنتی ہے۔[۴۹] اس کتاب کی لسانی لحاظ سے بڑی اہمیت ہے۔ اس کتاب کی زبان کو پراکرت اور جدید ہندوستانی زبانوں کے درمیان ایک عبوری نمونہ قرار دیا جا

سکتا ہے۔اس میں وہی لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قدیم پنجابی، قدیم برج، قدیم دکنی اور قدیم مرہٹی میں بھی ملتی ہیں۔ متصوفانہ موضوعات کے بیان میں فارسی ذخیرہ لغت پہلی بار زیادہ تعداد کے ساتھ ملتا ہے۔ ''خوب ترنگ'' گجری ادب کی روایت میں تخلیق ہونے والے صوفیانہ ادب کی فکر انگیز کتاب ہے۔ خوب محمد چشتی اس دور کا اہم تخلیقی ذہن ہے جس نے مثنوی مولانا روم کی طرز پر حکایات لکھ کر زندگی کے حقائق اور فلسفہ کو پیش کیا۔

''چھند چھنداں'' سے اُردو کے تخلیقی وجود کو فارسی بحروں سے روشناس کرایا گیا اور اس کی منفرد پہچان کے وسیع مواقع فراہم کر دیے گئے۔ یہ کتاب فارسی اوزان کے تعارف کے لیے ہندوی میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں صرف عروض ہندی کا ذکر ہے اور ہندی کے اوزان کی فارسی سے مطابقت دکھائی گئی ہے۔ دوسرے حصے میں عروض کی باتیں ہیں۔ اُردو ادب کی تاریخ میں اس کتاب کو ایک ہنگامہ خیز انقلاب سے تعبیر کیا گیا ہے، اس انقلاب کا پہلا نتیجہ محمد قلی قطب شاہ کی کلیات ہے جس میں اُردو زبان اوزان و بحور، جذبات، تخیل اور تشبیہ اور محاورے میں فارسی زبان کی تابع بنا دی گئی۔ ''چھند چھنداں'' نے قدیم اُردو کا ادبی منظرنامہ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ کتاب ایک نئے عہد کے طلوع ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ جب فارسی اوزان اختیار کرنے کی روایت پڑی تو اوزان اپنے ساتھ فارسی کی شعری لغت، نغمگی اور طرزِ احساس کی لہر بھی لیتے آئے۔ مستقبل میں ان فارسی اوزان کی وجہ سے مقامی روایت سے بننے والے الفاظ رفتہ رفتہ زبان کے نئے مزاج سے ہم آہنگی نہ پا کر گریز پا ہونے لگے۔[۵۰]

شیخ خوب محمد چشتیؒ کی ایک کتاب بھاؤ بھید بھی ہے جو شاعری کی صنعتوں کا ذکر کرتی ہے۔ صنائع کی بنیادی تعریف وتشریح فارسی میں ہے لیکن ساتھ ہی گوجری زبان میں مفہوم ادا کر دیا گیا ہے۔ علم صناع سے شعر میں حسن پیدا کیا جاتا ہے۔ بھاؤ بھید اور چھند چھنداں دونوں نے فارسی بحروں کو ہندی میں مقبول بنانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر ابراہیم ڈار[۵۱] کہتے ہیں کہ اس انقلاب انگیز تغیر نے اُردو کے مستقبل کا فیصلہ کر دیا جس کے مطابق فارسی بحروں اور خیالات

کو ہندی میں منتقل کیا گیا۔ محمد قلی قطب شاہ کی قدیم اُردو (دکنی) شاعری میں اس کا اثر نظر آتا ہے۔ یہی اثر ولی اورنگ آبادی سے ہوتا ہوا شمالی ہند کی اُردوئے معلیٰ تک پہنچا ہے۔

ڈاکٹر تبسم کاشمیری لکھتے ہیں:

''ہر زبان کا ایک تہذیبی باطن ہوتا ہے اور یہ تہذیبی باطن زبان کی شناخت بن جاتا ہے۔ اُردو کے تہذیبی باطن میں ایک طرف برصغیر کا مقامی وجود اور دوسری طرف عرب و عجم اور وسط ایشیائی وجود کا تشخص موجود ہے۔ وہ زبان جسے ہم اُردو کہتے ہیں، اس کا تہذیبی باطن ان ہی عناصر سے مرتب ہوتا ہے۔ گجراتی ادب ہو یا دکنی ادب --- ان ادبیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم اس تہذیبی باطن پر برابر نظر رکھتے ہیں۔'' [۵۲]

شمالی ہند میں صوفیا فارسی زبان میں شعر کہتے اور اقوال درج کرتے رہے مگر گجرات میں مقامی زبان کو ذریعۂ اظہار بنایا گیا۔ گجرات کے صوفیا اپنا پیغام گجری میں دے رہے تھے۔ گجری ادب میں گجری زبان کو ترجیح دینے کی وجہ یہ تھی کہ گجرات میں فارسی زبان و ادب کی روایت گہری نہ تھی۔ ان لوگوں نے زبان کا ایسا ڈھانچا بنالیا تھا جو عام لوگوں کو آسانی سے سمجھ آسکتا تھا۔ اس دور کی گجری زبان پر مقامی روایت کا غلبہ گہرا تھا اور بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری یہ غلبہ فکری اور لسانی سطح پر آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔[۵۳] گجری ادب میں گجری کو بولی کی سطح سے اُٹھا کر ادبی شکل دینے والے صوفیا شیخ باجن خوب محمد چشتی، علی محمد جیو گام دھنی اور قاضی محمود دریائی تھے۔ ان لوگوں نے زبان کی صلاحیت اور توانائی میں اضافہ کیا۔ شیخ باجن کی زبان پر برج بھاشا اور ہندی کی روایت کا گہرا اثر ہے۔ زبان کی قدیم شکلیں اُن کی شاعری کے وجود کو مقامی روایت سے ہم آہنگ کرتی ہیں۔ مقامی اصناف اور بحروں کا استعمال ان اصناف سے وابستہ روایات کو بھی ان کے کلام میں ظاہر کرتی ہیں۔ اصناف اختیار کرنے کا مطلب کسی زبان کے طرزِ احساس اور اس کے تخلیقی سانچوں کو اختیار کرنا ہے۔ باجن کے لکھے ہوئے دوہرے ہندی طرزِ احساس کی عام صداقتوں اور تجربات کے مظہر ہیں۔ ان کے پیچھے ہندوستانی روایت

کا صدیوں پرانا تجربہ اور دانش موجود ہے۔[۵۴]

اس دور کے صوفیا زبان کے عوامی پیکر تراشتے ہیں اور اس لسانی پیکر میں ہدایت اور نصیحت کرتے ہیں۔ اُن کی زبان کو ممتاز کرنے والی شے اسلام کی حقانیت کے تصورات تھے۔ حافظ محمود شیرانی نے اس بات کی تائید میں لکھا ہے:

''ان ایام میں اُردو زبان کے امتیازی خط و خال جو دوسری زبانوں سے اسے ممیّز کرسکیں، صرف معدودے چند ہیں یعنی یہ کہ اس زبان میں مسلمانی جذبات و خیالات ہوں، اس میں ایک حد تک عربی و فارسی کا عنصر موجود ہو۔''[۵۵]

لسانی اعتبار سے باجن کی کتاب ''خزائن رحمت اللہ'' قدر و قیمت کی حامل ہے۔ یہ اُردو کے قدیم ترین روپ کا مستند نمونہ بھی ہے اور اُردو میں غنائیہ شاعری کی روایت کو پروان بھی چڑھاتی ہے۔

اس دور کے صوفیا صوفیانہ طرزِ اظہار کی صنف جکری کو استعمال کرتے ہیں۔ قاضی محمود دریائی کی شہرت کا سبب ان کی لکھی ہوئی جکریاں ہیں۔ جکری نظام الدین اولیا کے زمانے میں بھی موجود تھی۔ قاضی محمود دریائی نامور صوفی خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو بیرپور گجرات میں آباد تھا۔

صوفیا کے ساتھ محبت و عقیدت بہمنی سلاطین کی موروثی روایت بن گئی تھی۔ دکن کی تاریخ میں بہمنی دور کو ''امتزاج'' کا دور کہا جاتا ہے۔ عربی، فارسی اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کے امتزاج سے دکن میں قدیم اُردو کی لسانی تشکیل ہو رہی تھی۔ بہمنی سلطنت دکن میں اُردو ادب کی پہلی تخلیقی تجربہ گاہ تھی اور حضرت خواجہ گیسو دراز اور شاہ میراں جی شمس العشاق جیسے صوفیا کی سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ بہمنی ریاست میں ایسے صوفیا شعرا ہیں جنہوں نے دکن کی سرزمین پر اُردو غزل کے رنگ روپ کو تشکیل دیا۔ دکنی ادب کے ابتدائی دَور میں زبان کا ایک منصب صوفیانہ تصورات کا اظہار تھا۔ اس لیے اس دور کی کاوشوں کو ''صوفیانہ ادب'' سے تعبیر کیا

جا سکتا ہے۔ ان کی اصل قدر و قیمت اور اہمیت لسانی اور تاریخی ہے۔ حضرت شاہ میراں جی شمس العشاق اور دوسرے صوفیا کی تحریریں صوفیانہ ادب کے زمرے میں آتی ہیں اور اُن کا جائزہ ان کے اپنے عہد کے لسانی پس منظر میں رکھ کیا جا سکتا ہے۔ دوہے کا استعمال اور اس سے دلچسپی کی وجہ دوہے میں اخلاقیات اور سوز و گداز کی موجودگی تھی اور یہی کیفیت صوفیانہ طرزِ احساس میں بھی موجود تھی۔

قدیم اُردو کے سلسلے میں دکن میں حضرت میراں جی شمس العشاق اور ان کے خاندان کے جانشینوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں، اس لیے اُردو کے صوفیانہ ادب میں ان کا ممتاز مقام ہے۔ برہان الدین جانمؔ کے خاندان کی لسانی اور صوفیانہ خدمات کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ دکن میں قدیم اُردو کی اشاعت کا سلسلہ مقامی صوفیا کی تصنیف و تالیف کے حوالے سے شروع ہوتا ہے۔ صوفیا کی خانقاہوں اور درگاہوں میں صوفیانہ ادب تسلسل کے ساتھ تخلیق ہوتا رہا۔ انہوں نے قدیم اُردو کو رشد و ہدایت کے لیے استعمال کیا۔ جانم کی شاعری میں لسانی شعور کے ساتھ فکری سطح بھی موجود ہے۔ جانمؔ کے والد حضرت شمس العشاق کے ہاں ابلاغ کا مسئلہ کم دشواری پیدا کرتا ہے اور بقول ڈاکٹر تبسم کاشمیری ''فارسی کی شعری لغت کی آمیزش سے ان کا اسلوب کافی حد تک عام فہم زبان کے معیارات تک جا پہنچتا ہے۔'' [۵۶] اُنہوں نے مقامی شعری لغت کی روایت سے اللہ کے اوصاف اور اس کی ذات کی مختلف سطحوں کو اُجاگر کیا ہے اور اللہ کو مقامی لسانی روایت کے شعور میں دیکھا ہے۔ [۵۷]

بیجاپور میں فارسی شعر و ادب کا چرچا گولکنڈہ سے زیادہ رہا، لیکن فارسی ادب کی روایت کے فروغ کا عمل بہت محدود رہا اور دکنی زبان پر اس کا کوئی خاص اثر مرتب نہ ہو سکا۔ بیجاپوری کی لسانی روایت پر ہندوی اثرات کا غلبہ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بیجاپوری صوفیا زبان کے ادبی اوصاف سے زیادہ زبان کے ابلاغ پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مقصد اپنی بات کو عام آدمی تک پہنچانا تھا۔ اس لیے وہ عام فہم زبان استعمال کرتے رہے۔ بیجاپوری صوفیا کی زبان

فارسی اثرات کی صحبت سے گریز کرتی رہی جبکہ گولکنڈہ میں فارسی کے شعری اسالیب آہستہ آہستہ سرایت کرتے رہے نثری اسلوب میں جانم کے ہاں فارسی اور ہندوی اسالیب کا امتزاج بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن زبان کا ڈھانچا دکنی ہی رہتا ہے مگر فارسی لغت کے ملاپ سے یہاں ایک ایسا اسلوب ابھرتا ہے جو جانم کے شعری اسلوب کے مقابلے میں مختلف ہے۔[۵۸]

تاریخ کے کسی دور میں لکھا گیا ادب اُس دَور کی زبان اور اسالیب کی شہادت دیتا ہے اور ساتھ ہی اُس دور کی روحانی ضروریات کو بھی پورا کرتا ہے۔ ہم صوفیا کی نگارشات کو صوفیانہ ادب کے لحاظ سے بھی پڑھ سکتے ہیں اور لسانی معیارات کی جانچ پرکھ کے لیے بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ غرض کہ برصغیر کے کسی علاقے کی بولی یا زبان کو لیں، وہ اُردو کے وسیع سمندر میں مدغم ہے قدیم دَور میں بھی اور اب بھی اس لیے یہ کہنا کہ اُردو اس علاقے کی زبان ہے اور اُس علاقے کی نہیں محض ایک ضد ہے۔ یہ ہر علاقے کی زبان ہے، بقول ڈاکٹر الف۔د۔نسیم یہ برصغیر کی ''پدری زبان'' ہے۔ مادری زبان کچھ بھی ہو، اس کو ہر کوئی سمجھتا بوجھتا اور بولتا چالتا ہے۔ ہمارے صوفیا نے اسی لیے اسے استعمال کیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو صوفیا اور ان کا پیغام دونوں محدود اور علاقائی ہو جاتے۔ یہ تصوف اور اُردو ہی کی برکت ہے کہ سرحد، پنجاب، دہلی، ہانسی، راجستھان، پانی پت، بہار اور ملتان کے صوفیا ایک تسبیح کے دانوں کی طرح ہیں، ان کا پیغام مختلف رنگوں کے باوجود یک رنگ ہے۔ ان کے معتقدوں، مریدوں اور ماننے والوں میں محبت اور یگانگت ہے، چاہے وہ کہیں کے کیوں نہ ہوں اور اُن کی زبان چاہے کسی علاقے کی کیوں نہ ہو۔ لفظی، معنوی اور اسلامی اعتبار سے اُردو مرکزیت پر قائم ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کو مختلف اللسان اور مختلف المقام ہونے کے باوجود صدیوں جس سبب نے ایک لڑی میں پروئے رکھا، وہ یہی ''صوفیا اختیاری'' تھی۔ ایک علاقے کا صوفی ہر علاقے کا صوفی ہے۔ بخلاف جدید دور کے غلط سیاسی رجحانات کے جس نے رہنماؤں کو علاقائی اور مقامی بنا دیا ہے۔ آج بھی برصغیر کے ایک علاقے کا رہنے والا دوسرے علاقے کے سیاسی

رہنما اور زبان کو تو نہیں مانتا لیکن صوفی اور اس کی زبان کو مانتا ہے۔ مانتا ہی نہیں اپنے عقیدے کا جزو خیال کرتا ہے۔[۵۹]

حوالہ جات

[۱]　افتخار عارف، پیشِ لفظ "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء" از ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۷ء، طبع اوّل۔

[۲]　مولوی عبدالحق "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"، نئی دلی: انجمن ترقی اُردو (ہند)، ۲۰۰۱ء، ص۴۔

[۳]　افتخار عارف، پیشِ لفظ، "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء"، از ڈاکٹر الف۔د۔نسیم۔

[۴]　ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء"، ص۹-۱۰۔

[۵]　ایضاً، ص۱۰-۱۱۔

[۶]　ایضاً، ص۱۵-۱۶۔

[۷]　اخبار الاخیار فی تذکرۃ الاسرار بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء"، ص۱۸۔

[۸]　بزمِ صوفیا بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء"، ص۵۰۔

[۹]　ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیا"، ص۵۰-۵۱۔

[۱۰]　ایضاً۔

[۱۱]　مولوی عبدالحق، "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام"، ص۵۔

[۱۲]　ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، "اُردو قدیم اور چشتی صوفیا"، ص۵۲۔

[۱۳]　ایضاً، ص۵۲-۵۳۔

[۱۴]　ایضاً، ص۵۴، بحوالہ سیر الاولیاء، از سید مبارک۔

[۱۵]　محمود شیرانی "پنجاب میں اُردو"، نئی دہلی: قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ۱۹۸۲ء، ص۲۱۲۔

[۱۶]　بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیا"، ص۵۴۔

[۱۷]　ایضاً، ص۶۴ تا ۶۷۔

[۱۸]　مولوی عبدالحق، "اُردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا حصہ"، ص۱۰۔

[۱۹]　ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، "اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء"، ص۷۱۔

[۲۰]　ایضاً، ص۷۸۔

[۲۱] ایضاً، ص ۹۹۔

[۲۲] ایضاً، ۱۰۰-۱۰۱۔

[۲۳] ڈاکٹر سیدہ جعفر، ''دکنی نثر کا انتخاب'' نئی دہلی: ''ترقی اُردو بیورو، ۱۹۸۳ء، پہلا اڈیشن، ص ۱۰۳۔

[۲۴] ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص ۱۰۲-۱۰۳۔

[۲۵] ایضاً، ص ۱۰۴۔

[۲۶] اُردوئے قدیم از شمس اللہ قادری بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ص ۱۰۵۔

[۲۷] رُودِ کوثر، از شیخ محمد اکرام، بحوالہ ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ص ۱۰۸۔

[۲۸] ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص ۱۱۰۔

[۲۹] مولوی عبدالحق، ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام''، ص ۳۴، ۳۵۔

[۳۰] ایضاً، ص ۳۶۔

[۳۱] ایضاً، ص ۳۴۔

[۳۲] ایضاً، ص ۴۹-۵۰۔

[۳۳] ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص ۱۱۶۔

[۳۴] ڈاکٹر سیدہ جعفر، مقدمہ ''دکنی نثر کا انتخاب''، ص ٦۔

[۳۵] ایضاً، ص ۸-۹۔

[۳٦] مولوی عبدالحق، ''اُردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام''، ص ۴۸۔

[۳۷] ڈاکٹر سیّدہ جعفر، ''دکنی نثر کا انتخاب''، ص ۳۱۔

[۳۸] ایضاً، ص ۳۱-۳۲۔

[۳۹] ایضاً، ص ۸۷-۸۸۔

[۴۰] مضمون، گوجری اور اُردو زبان کی نشو ونما میں اہلِ گجرات کا حصہ از پروفیسر ابراہیم ڈار، رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

[۴۱] ڈاکٹر الف۔د۔نسیم، ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص ۱۴۲-۱۴۳۔

[۴۲] محمود شیرانی، ''پنجاب میں اُردو''، ص ۱۴۸۔

[۴۳] ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ''اُردو ادب کی تاریخ''، جلد اوّل، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۳ء، ص ۵٦ تا ۵۸۔

[۴۴] ایضاً، ص ٦۲۔

[۴۵] ایضاً۔

[۴۶] محمود شیرانی، ''مقالات شیرانی''، مظہر محمود شیرانی، مرتب، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، جلد اوّل ۱: ۱۷۷۔

[۴۷] ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ''اُردو ادب کی تاریخ''، جلد اوّل، ص ۶۲، ۶۳۔

[۴۸] ایضاً، ''اُردو ادب کی تاریخ''، جلد اوّل، ص ۶۳-۶۴۔

[۴۹] ایضاً، ص ۶۴۔

[۵۰] ایضاً، ص ۶۶۔

[۵۱] پروفیسر ابراہیم ڈار، مضمون ''گوجری اور اُردو زبان کی نشو و نما میں اہلِ گجرات کا حصہ''، رسالہ اُردو، اکتوبر ۱۹۵۰ء۔

[۵۲] ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ''اُردو ادب کی تاریخ''، جلد اوّل، ص ۵۶۔

[۵۳] ایضاً، ص ۵۸۔

[۵۴] ایضاً، ص ۵۸-۵۹۔

[۵۵] ڈاکٹر جمیل جالبی، ''تاریخ ادب اُردو''، جلد اوّل، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۸۷ء، ص ۱۰۸۔

[۵۶] ڈاکٹر تبسم کاشمیری، ''اُردو ادب کی تاریخ''، جلد اوّل، ص ۱۰۹۔

[۵۷] ایضاً۔

[۵۸] ایضاً، ص ۱۱۰۔

[۵۹] ڈاکٹر الف۔ د۔ نسیم، ''اُردوئے قدیم اور چشتی صوفیاء''، ص ۱۲۶-۱۲۷۔